پروفیسر قاضی محمد طاہر الہاشمی قسط:۵

خلافت وملوکیت

ان تصریحات سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ آیتِ استخلاف کا وعدہ پوری امتِ مسلمہ سے ہے اور بالخصوص صحابہ کرام ﷺ سے جو آیت مقدسہ کے اوّلین مخاطب تھے۔ ان کا وعدۂ استخلاف سے اخراج کسی طور پر جائز نہیں ہے اور آیتِ کریمہ کو ''خلفائے اربعہ'' تک محدود کرنا محض سینہ زوری ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو **من کفر بعد ذٰلک** ..... کے حکم میں شامل بھی کرنا ہے۔

آیتِ استخلاف میں ''منکم'' کی بحث

کچھ لوگ آیتِ استخلاف کے لفظ ''منکم'' سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر اس سے عام امت مراد ہوتی تو لفظ ''منکم'' زائد اور بے فائدہ ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام زائد اور بے فائدہ لفظوں سے پاک ومنزّہ ہے لہذا اس سے وہی حضرات (خلفائے اربعہ) مراد ہیں۔ جو نزول آیت کے وقت موجود تھے۔ یہ تخصیص ''بعض'' کا اپنا خیال ہے۔ آیتِ استخلاف سے اس کی بالکل تائید نہیں ہوتی۔ جیسا کہ اوپر وضاحت ہوچکی ہے۔

مخالفینِ صحابہ نے اس نظریے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک دوسری آیت (آیتِ معیت) کو تختۂ مشق بنایا ہے۔

وعد اللّٰہ الذین اٰمنو ا وعملوا الصّٰلحٰت منھم مغفرۃ وّ اجراً عظیماً (پارہ ۲۶، سورۃ الفتح ۲۹)

وعدہ کیا ہے اللہ نے ان سے جو ایمان لائے اور کئے اچھے کام، معافی کا اور بڑے ثواب کا۔

دشمنانِ صحابہ کے نزدیک اس آیت میں لفظ ''منھم'' کی بناء پر جملہ صحابہ ﷺ وعدہ الٰہی میں شامل نہیں ہیں بلکہ وہ بعض ہیں جن کے لیے ایمان اور عمل صالح ثابت ہو۔ جبکہ مفسرین کرام نے ''منھم'' کے باوجود سارے صحابہ ﷺ کو آیت کا مصداق قرار دیا ہے۔ تفسیر عثمانی میں ہے کہ:

نبی کریم حضرت محمد ﷺ کے سب اصحاب ایسے ہی تھے..... بعض دوسرے بزرگوں نے (**والذین معہ' سجداً**) سے (آیتِ معیت کو) علی الترتیب خلفائے اربعہ پر تقسیم کردیا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ آیت تمام جماعت صحابہ ﷺ کی بہیئتِ مجموعی مدح ومنقبت پر مشتمل ہے خصوصاً اصحابِ بیعتِ رضوان کی جن کا ذکر آغاز سورت سے برابر چلا آرہا ہے۔

(تفسیر عثمانی تحت آیتِ معیّت)

امام اہل سنت مولانا عبدالشکور لکھنوی ؒ لکھتے ہیں کہ یہ ضمیر ''منھم'' کی الذین معہٗ کی طرف نہیں پھر سکتی ورنہ معاذ اللہ کلام میں تعارض ہوجائے گا۔ کیونکہ الذین معہٗ کے جو اوصاف اوپر بیان فرمائے ہیں، وہ بتارہے ہیں کہ وہ سب کے سب

مومن صالح تھے۔ غیر ممکن ہے کہ ان میں کچھ لوگ صالح ہوں، کچھ غیر صالح۔ بلکہ یہ ضمیر اس جماعت کی طرف پھر رہی ہے جس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں، جو بعد میں داخل اسلام ہوئے کھیتی کی مثال سے اسلام کی ترقی اور نئے لوگوں کا اسلام میں داخل ہونا مفہوم ہو رہا ہے۔ (مجموعہ تفسیرِ آیات قرآنی۔ص ۵۱۸)

جہاں تک استخلاف کا تعلق ہے تو اس کا اطلاق جملہ خلفائے صحابہ ﷺ پر بدرجہ اولیٰ ہوتا ہے اور ان کی خلافت ''خلافتِ راشدہ'' کا اوّلین مصداق ہے۔

علاوہ ازیں قرآن مجید ''ہدی للناس'' ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس کے عموم کو خصوص میں تبدیل کر کے یہ دعویٰ کیا جائے کہ آیت میں وعدۂ استخلاف آنحضرت ﷺ کے بعد صرف تیس برس کے لیے تھا۔ اگر علیٰ سبیل التنزل اس دعویٰ کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آیتِ استخلاف میں لفظ ''منکم'' سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وعدۂ استخلاف ان مؤمنین، صالحین سے ہے جو اس آیت کے نزول کے وقت موجود تھے اور اس وقت حضرت معاویہ ﷺ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے کیونکہ یہ آیت سورۃ النور کی ہے اور یہ سورۃ غزوہ بنو مصطلق کے بعد نازل ہوئی ہے اور اس میں اختلاف ہے کہ یہ غزوہ ۵ھ میں ہوا تھا یا اس کے بعد ۶ھ کے نصف آخر میں۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت معاویہ ﷺ اس کے بعد اسلام لائے تھے لہذا وہ آیتِ استخلاف کے مصداق نہیں بن سکتے۔ تو اس صورت میں بھی حضرت معاویہ ﷺ آیت استخلاف کے مصداق قرار پاتے ہیں کیونکہ وہ صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے مشرف باسلام ہوئے اور وہ آیت کے مخاطبینِ اوّل میں سے تھے۔ بعد میں انہوں نے ہجرت بھی کی۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ:

حضرت وائل بن حُجر ﷺ سے حضرت معاویہ ﷺ نے کہا کہ آپ ہماری مدد سے کیوں باز رہے..... میں (وائل بن حُجرؓ) نے جواب دیا..... اور ایک وجہ میرے شریک نہ ہونے کی یہ بھی ہے کہ میں مہاجرین سے لڑنا نہیں چاہتا۔ حضرتِ معاویہ ﷺ نے کہا کیا ہم لوگ مہاجر نہیں ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ اسی وجہ سے تو ہم آپ سے اور ان سے دونوں سے الگ رہے..... (ازالۃ الخفاء۔ ج ا، ص ۴۱۸)

اس کے بعد جو کچھ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ'' حضرتِ معاویہ ﷺ کو ہجرت کے معانی کا فرق معلوم نہیں ہو سکا۔'' (ایضاً، ص ۴۱۹) یہ ان کا اپنا خیال ہے جو یقیناً باعثِ تعجب ہے کہ ایک جلیل القدر اور فقیہہ صحابی تو ہجرت کا معنی نہ سمجھ سکے۔ مگر قاضی مظہر حسین صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب سمجھ گئے ہیں۔ حضرت معاویہ ﷺ یقیناً ان حضرات کی سند کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کے لیے حضور ﷺ کی دعائیں کافی ہیں۔ **اللھم علمہ الکتب ..... اللھم اجعلہ ھادیا و مھدیا و اھدبہ** اور ان کی فقاہت کے لیے حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ کی سند ''قد صحب رسول اللہ..... انہ فقیہ'' کافی ہے۔

بات حضرت معاویہ ﷺ اور حضرت وائل بن حُجر ﷺ کے درمیان چل رہی ہے۔ اوّل الذکر نے اپنے مہاجر ہونے کا دعویٰ کیا اور ثانی الذکر نے اسے تسلیم کر لیا اور اب شاہ صاحب اور قاضی صاحب کے نہ تسلیم کرنے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اپنے اس قول، مدینہ منورہ میں مستقل قیام اور پھر تحصیلِ علم کے لیے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضری کے علاوہ آپ ﷺ کی معیت میں غزوات میں شرکت جسے شاہ ولی اللہؒ نے بھی دوسرے معنی کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کی ہجرت قرار دیا ہے۔ شاہ صاحب کی اس توجیہ کے مطابق تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو دونوں طرح کی ہجرت کی سعادت حاصل ہوگئی ہے۔

جناب قاضی مظہر حسین کا یہ دعویٰ کہ سورۃ النور غزوۂ بنی المصطلق کے بعد نازل ہوئی اور یہ غزوہ ۶ ھ کے نصف آخر میں پیش آیا تو اب سوال یہ ہے کہ ۶ ھ کا نصف آخر ۷ ھ تک جا سکتا ہے۔ اب اس کے کتنے عرصہ بعد سورۃ النور نازل ہوئی اس کے بدلے میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ تو پھر فریق مخالف کے دعویٰ کی کیا حیثیت باقی رہی ؟

مزید برآں کیا یہ ضروری ہے کہ کسی سورۃ کی تمام آیات یکبارگی نازل ہوگئی ہوں اس سورۃ (النور) کے ۹ رکوع اور ۶۴) آیات ہیں۔ کیا اس کے نزول کی تکمیل ۷ ھ تک ہی ہوگئی تھی۔ علمائے تفسیر کے درمیان سورتوں کی ترتیبِ نزولی کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ سب کسی ایک ترتیب پر متفق نہیں ہیں۔ علامہ جلال سیوطیؒ نے بھی اپنی کتاب الاتقان میں مختلف اور متضاد اقوال نقل کئے ہیں۔ مفسرین کے نزدیک مکی سورتوں کی تعداد تراسی ۸۳ ہے اور مدنی سورتوں کی تعداد اکیس ۲۱ ہے۔

ایک ترتیب کے مطابق سورۃ النور کے نزول کا نمبر (مدنی سورتوں میں) ۱۹ ہے۔ جبکہ نمبر ۱۸ پر سورۃ اذا جآء نصر اللہ اور نمبر ۲۰ پر الحج ہے۔ (نظرات فی القرآن للشیخ محمد الغزالی طبع دوم۔ ص، ۲۵۸۔ بحوالہ فقہ القرآن ج ۵ ص ۸۵)

بہرحال اس تفصیل سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک تو یہ کہ مدنی سورتوں کے نزول کے اعتبار سے سورۃ النور کا نمبر ۱۹ ہے اور وہ اذا جآء نصر اللہ نمبر ۱۸ کے بعد اور سورۃ الحج نمبر ۲۰ سے پہلے نازل ہوئی تھی اور حج سنہ ۹ ھ میں فرض ہوا ہے۔

مولانا محمد منظور نعمانیؒ لکھتے ہیں کہ:

حج کی فرضیت کا حکم راجح قول کے مطابق سنہ ۹ ھ میں آیا ہے۔ اور اسکے اگلے سال سنہ ۱۰ ھ میں اپنی وفات سے صرف تین مہینہ پہلے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہت بڑی جماعت کے ساتھ حج ادا فرمایا جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ (معارف الحدیث ج ۴ ص ۱۸۸)

سورۃ اذا جآء نصر اللہ کا نزول بھی متفقہ طور پر فتح مکہ سنہ ۸ ھ کے بعد ہی ہوا ہے۔ بلکہ صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ اذا جآء نصر اللہ کا نزول بھی سنہ ۹ ھ ہی کا ہے۔ اس روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے سورۃ اذا جاء نصر اللہ کے بارے میں شیوخ بدر کے سامنے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے استفسار پر فرمایا کہ یہ حضور ﷺ کی وفات کی اطلاع ہے۔ جو اللہ نے آپ کو بتادی ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "مَا اَعلَمُ مِنهَا اِلَّا مَا تَقُوْل" میں (بھی) اس کے متعلق اس سے زیادہ نہیں جانتا جو تم کہہ رہے ہو۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ اذا جاء نصر اللہ)

واضح رہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ کا یہ بیان شیوخ بدر کے سامنے ہے جو حضرت عمر ﷺ کی مجلس شوریٰ کے رکن اور اکابر صحابہ میں سے تھے اور کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کو وفات کی اطلاع آپ ﷺ کی وفات سے کچھ ہی پہلے دی گئی ہوگی جس کا امکان یقینی طور پر سورۃ حج کے نزول سے ذرا پہلے ہوسکتا ہے اور سورۃ النور تو اذا جاء نصر اللہ کے بھی بعد نازل ہوئی ہے لہذا اس کا نزول سنہ ۹ ھ میں ہی ہوسکتا ہے۔

جناب جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ:

جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ کاتبین وحی کو ساتھ ہی یہ بتا دیتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں مقام پر لکھ لیا جائے۔ چنانچہ وہ آپ ﷺ کے بتائے ہوئے مقام پر درج ہو جاتی تھی۔ ترتیب نزول کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ آنحضرت ﷺ نے فرمائی اور نہ صحابہ ﷺ نے۔ اس لیے جب قرآن مکمل ہوگیا تو لوگوں کو یہ یاد بھی نہیں رہا کہ کونسی آیت کس ترتیب سے نازل ہوئی تھی۔ لہذا اب جزوی طور پر بعض سورتوں یا آیتوں کے بارے میں تو یہ علم ہو جاتا ہے کہ ان کی ترتیب کیا تھی لیکن پورے قرآن کی ترتیب نزول یقین کے ساتھ بیان نہیں کی جاسکتی۔

علامہ سیوطیؒ نے ''الاتقان'' میں بعض روایات کے مدد سے سورتوں کی ترتیب نزول بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن درحقیقت ان روایتوں سے یقینی طور پر صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کون سی سورت مکی اور کون سی مدنی ہے۔ ترتیب نزول کی تفصیلات ان سے معلوم نہیں ہوتیں، ماضی قریب میں بعض مستشرقین نے بھی ترتیب نزول معیّن کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ہماری نظر میں یہ ساری کوششیں ایک ایسے کام میں اپنا وقت صرف کرنے کے مترادف ہیں جس میں کبھی یقینی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ (علوم القرآن۔ ص ۶۹۔۷۱)

اس تفصیل سے اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ سورۃ النور (جس میں آیتِ استخلاف ہے) کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ کوئی دعویٰ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ کہ وہ کب نازل ہوئی ہے۔ غالباً اسی لئے قاضی مظہر حسین صاحب نے یہ لکھ کر جان چھڑالی کہ ''اس کا نزول غزوہ بنی المصطلق کے بعد ہوا ہے اور یہ غزوہ سنہ ۶ ھ کے نصف آخر میں پیش آیا۔''

(حضرت معاویہ ﷺ کے نادان حامی غالی گروہ۔ ص ۲۷)

یہ سورۃ اس غزوہ کے کتنے عرصے بعد نازل ہوئی؟ اور کیا یہ سورۃ جو نو رکوعات اور چونسٹھ آیات پر مشتمل ہے یکبارگی اور دفعتاً نازل ہوئی؟ کیا اس سورۃ کی آیات موجودہ ترتیب (جس میں آیت استخلاف کا نمبر پچپن ہے) کے مطابق نازل ہوتی رہیں۔

جب اس سورۃ کے سن نزول کے بارے میں ہی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا تو پھر قاضی صاحب خواہ مخواہ جبر اور زبردستی سے کام لیتے ہوئے تیقن کے ساتھ حضرت معاویہ ﷺ کو آیت استخلاف کے مصداق سے کیوں خارج قرار دے رہے ہیں۔ کیا یہ اہلسنت کی خدمت ہے یا سبائیت کی؟ کیا سبائیت کی خدمت کرنے والا بھی خادم اہل سنت کہلا سکتا ہے؟

پھر آپ کے ارشاد کے مطابق بھی اس سورۃ کا نزول ۶ ھ کے نصف آخر کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا نزول ۷ ھ تک تو جا سکتا ہے اسے تسلیم کرتے ہوئے بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ آیتِ استخلاف کا مصداق قرار پاتے ہیں۔ کیونکہ وہ عمرۃ القضاء ۷ ھ میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بال بھی تراشے تھے۔ امام اہل سنت مولانا عبدالشکور لکھنوی کے بقول تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ صلح حدیبیہ کے سال (۶ ھ) اسلام لائے۔

(ازالۃ الخفاء۔ ج ۱، ص ۴۷۲)

اور اس قول کے بارے میں جناب قاضی صاحب کا یہ فیصلہ ہے کہ ''صلح حدیبیہ کے سال اسلام لانے کا قول مرجوح ہے۔ (حضرت معاویہؓ کے نادان حامی ص ۲۹) مگر ہے تو سہی۔

جناب قاضی صاحب امام اہل سنت کے قول کو مرجوح قرار دے سکتے ہیں اور ان کے بارے میں یہ بھی لکھ سکتے ہیں کہ ''یہاں امام اہلسنت کا یہ لکھنا محلِ نظر ہے کہ ان یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد پھر مسند خلافت کو کوئی صحابی نصیب نہیں ہوا۔ حالانکہ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نو سال تک مسندِ خلافت پر فائز رہے...... امام اہل سنت غالباً خلفائے راشدین کی نظر ثانی نہیں کر سکے، ورنہ زیر بحث عبارت قابل اصلاح تھی۔ (خارجی فتنہ۔ ج ۲، ص ۳۸۔ ۶۳۶)

یقیناً یہ علمی اختلاف ان کا حق ہے تو اسی ''حق'' کے تحت جب کوئی دوسرا شخص ان کے قول کو مرجوح قرار دے کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو آیتِ استخلاف کا مصداق ثابت کرتا ہے تو وہ فوراً اسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا نادان حامی، غالی گروہ میں شامل کر دیتے ہیں۔

دراصل جناب قاضی صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات کو اس بات سے شدید غلط فہمی پیدا ہوئی ہے کہ انہوں نے واقعۂ افک اور آیتِ استخلاف کو لازم وملزوم اور ایک ہی سلسلہ کی کڑی سمجھ لیا ہے اسی لیے وہ یہ لکھتے ہیں کہ آیتِ استخلاف سورۃ نور کی ہے اور یہ سورۃ بنی المصطلق کے بعد نازل ہوئی ہے...... اور اس میں اختلاف ہے کہ یہ غزوہ ۵ ھ میں ہوا تھا یا اس کے بعد ۶ ھ کے نصف آخر میں (عقیدہ خلافتِ راشدہ اور امامت۔ ص ۱۲)

چونکہ غزوہ بنی المصطلق کے بعد واقعہ افک رونما ہوا تھا اسی پر قیاس کرتے ہوئے انہوں نے آیتِ استخلاف کو اس کے ساتھ نتھی کر دیا جبکہ یہ دونوں جدا جدا اور الگ الگ ہیں۔ واقعہ افک میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کا ذکر ہے جس کا اہتمام غزوہ بنی مصطلق کے بعد ہوا اور آیتِ استخلاف میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خلافت عطا کئے جانے کا وعدہ ہے۔

افک کے بارے میں آیات کے نزول کو تو کسی حد تک غزوۂ بنی المصلطق کے بعد تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ (اگرچہ افک کے بارے میں بھی شدید اختلاف پایا جاتا ہے) لیکن آیتِ استخلاف کے نزول کو اس کے ساتھ شامل کرنا محض سینہ زوری ہے۔ (جاری ہے)